ذوالفقار دانش

مشائخِ سندھ کی مکتوب نگاری: محرکات اور اسلوب

انسانی زندگی میں مکتوبات کی اہمیت ماضی میں اظہر مِن الشّمس رہی ہے۔اسی لیے اِسے آدھی ملاقات کہا جاتا رہا۔ اگر موجودہ سائنسی ترقی کو کچھ دیر کے لیے معدوم کردیا جائے تو مکتوبات کی وقعت اور ضرورت میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہوجائے گا۔سائنسی ترقی کے باوجود آج بھی مکتوبات کی اہمیت مسلّم ہے۔مکتوبات نگاری یا خطوط نگاری کی تعریف کرتے ہوئے رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ہم ایک شخص سے کوئی بات کہنا چاہیں اور وہ ہمارے سامنے موجود نہ ہوتو اپنی بات اور گفتگو اُسے لکھ بھیجنا،مکتوب نگاری یا خط نویسی کہلائے گا۔(۱)

گویا کسی غیر موجود شخص کو اپنے خیالات، جذبات، افکار اور دیگر معلومات تحریری طور پر کسی کے توسط سے ارسال کرنا، مکتوب نگاری ہے۔خط کو نصف ملاقات کہا جاتا رہا ہے، اب دورِجدید میں خیالات کے تبادلے کے لیے جو ذرائع دستیاب ہیں،اُن میں نہ صرف براہِ راست گفتگو کی جاسکتی ہے بلکہ ایک دوسرے کے چہرے کے تاثّرات،حرکات وسکنات اور ماحول کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اِس صورت کو کون سی اور کتنے فی صد ملاقات کہا جائے؟

مذکورہ صورت کے باوجود خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔بعض اوقات یہ اظہارِ مدّعا کے لیے ملاقات سے زیادہ افادیت کے حامل ہوجاتے ہیں،وہ اس لیے کہ گفتگو کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جو بالمشافہ ملاقات میں نہیں کہے جاسکتے،اِن پہلوؤں کو خطوط کی صورت میں ضبطِ تحریر میں لایا جاسکتا ہے،کیوں کہ ''مکتوب میں شخصیت کے اظہار اور ذاتی جذبات واحساسات کے شمول کی گنجائش ہر دوسری تحریر کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔''(۲) بعض شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو گفتگو میں مہارت نہیں رکھتیں،وہ اپنا نقطۂ نظر تحریر میں خوش اسلوبی سے بیان کرجاتی ہیں۔اِن افراد کے لیے بھی خطوط اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔مکتوبات

میں لکھاری کو اپنی بات وضاحت سے مفصل بیان کرنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

خطوط کو کئی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، سرکاری، نجی، کاروباری، تعزیتی، اطلاعی، دعوتی، علمی، ادبی وغیرہ۔ بطورِ صنفِ ادب جب مکتوبات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ان سے مراد علمی اور ادبی خطوط ہی ہوتے ہیں۔ ان مکتوبات کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

اوّل وہ خطوط جن کے مکتوب نگار کو یہ اندازہ نہیں ہوتا، کہ اُن کے تحریر کردہ مکتوب اشاعت کے مراحل طے کریں گے۔

دوم وہ خطوط جن کے مکتوب نگار کو امید ہوتی ہے، کہ اُن کے لکھے ہوئے خطوط شائع ہو سکتے ہیں، ایسے خطوط میں ایک خاص انداز ہوتا ہے، مکتوب نگار کے احتیاط برتنے کے سبب اُس کی شخصیت کے کئی پہلو چھپ جاتے ہیں۔

خطوط کی اہمیت صرف علمی اور ادبی ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ مکتوب نگار کے رجحانات اور افکار کے ترجمان ہونے کے ساتھ اُن کی شخصیت کا آئینہ بھی ہوتے ہیں۔ جس میں اُس کی شخصیت کو شفّاف انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بقول شخصے:

> درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور صاحبِ علم اپنے مکتوبات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔[۳]

یہی نہیں تحقیق میں خطوط کو داخلی شہادت اور اوّلین ماٰخذ کی حیثیت میں اہم مرتبہ حاصل ہے۔ خلیق انجم اس بارے میں کہتے ہیں کہ ''سوانح کا بہترین ماخذ خطوط ہوتے ہیں۔''[۴] اسی طرح مولوی عبدالحق کے بیان سے بھی خطوط کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔''[۵]

مکتوب میں اندازِ نگارش سادہ اور واضح ہونا چاہیے۔ ایجاز و اختصار خطوط نویسی کی اہم خصوصیت ہے۔ ایجاز و اختصار میں مقصد فوت نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ مقصد کی تفہیم لازمی امر ہے۔ پُر تکلف اندازِ بیاں، نامانوس الفاظ اور تراکیب کا بے جا استعمال خطوط کی عبارت کو بوجھل بنا دیتا ہے، جس سے نثر کا حسن اور روانی متاثر ہوتی ہے۔ مکتوب نگاری کا شمار خانقاہی ادب کی ابتدائی اصناف میں ہوتا ہے۔ اِن میں علمی، دینی، سماجی اور اصلاحی پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن سے فرد اور معاشرے کو رہنمائی ملتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اوّلین خط کا تذکرہ قرآن میں حضرت سلیمانؑ کے حوالے سے مذکور ہے۔[۶]

بعدازاں حضورِ اکرمؐ اور صحابۂ کرامؓ کے دعوتی رقعے[۷] بھی اسلامی تاریخ میں محفوظ ہیں۔خانقاہی ادب میں بھی اصلاحی اور تربیتی مقصد کے لیے مکتوب نگاری ہوئی ہے۔مشائخ نے اپنے مریدین اور عقیدت مندوں کے راہِ سلوک میں آنے والے اِشکالات کے جوابات کے لیے خطوط تحریر فرمائے۔

زیرِ بحث مقالے میں مشائخِ سندھ (ماسوائے سلسلۂ نقش بندیہ) کے مکاتیب کے مقاصد، محرکات اور اسلوب کا تحقیقی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے کیوں کہ نقشبندی سلسلے کے مکاتیب کا تجزیہ تحقیق میں شائع ہو چکا ہے۔[۸]

مکتوباتِ علمی غلام رسول قادری کے ۳، اور صاحب زادہ محمد علم الدین القادری کے ۱۷ خطوط کا مجموعہ ہے جسے اوّل الذکر کے پوتے اور ثانی الذکر کے فرزند ڈاکٹر صاحب زادہ فریدالدین قادری نے مرتّب کیا ہے۔ مذکورہ تمام مکتوبات غلام رسول القادریؒ کے مرید صادق صوفی نذیر احمد خاں قادری کے ارسال کردہ خطوط کے جوابات ہیں۔ برصغیر کے خانقاہی ادب میں مکتوبات اصلاحی خصوصیات کے حامل رہے ہیں۔ بالخصوص محمد احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں جو معرفت کے نکات پنہاں ہیں، اُن کی شرح، تفہیم اور تدریس کا سلسلہ آج بھی خانقاہوں میں جاری وساری ہے۔ اسی طرح مکتوباتِ معصومیہ اور مکتوباتِ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے مسافرانِ معرفت فیض پا رہے ہیں۔

مکتوبات علمی کو مرتّب کرنے کا اوّل محرک تو خدمتِ خلق اور اصلاحِ عام وخاص ہے جس کا اظہار سرورق پر یوں کیا گیا ہے کہ ''رشد وہدایت سے بھرپور خطوط کا مجموعہ جس میں پیغام، اصلاح اور ذہنی الجھنوں کا حل بھی موجود ہے۔'' اِن مکتوبات کا دوسرا اشاعتی پہلو یہ ہے کہ مرتّب اپنے اکابرین کی فکر، کردار اور وسعتِ علمی سے عوام وخواص کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کے سرورق پر مذکورہ تحریر مبنی برحقیقت ہے کیوں کہ یہ جن خطوط کے جواب میں تحریر کیے گئے ہیں، اُن میں سفرِ سلوک میں پیش آنے والے معاملات، مسائل، اِشکالات اور ذہنی الجھنوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کے جواب میں صاحب زادہ علم الدین القادریؒ نے ان تمام پہلوؤں کے تسلّی بخش جوابات، تربیتی اور صوفیانہ پہلوؤں سے دیے ہیں۔ اَب اِن مکتوبات سے شاہراہِ معرفت پر گام زن دیگر مسافر بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اِن مکتوبات میں عمومی انداز میں بیان کردہ نکات طالبانِ معرفت کے لیے رہ نما ثابت ہو سکتے ہیں۔ ۱۵/ اگست ۱۹۸۲ء کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''آپ اپنی طبعی وذہنی کم زوری سے بعض اوقات بے چین ومضطرب ہوجاتے ہیں۔ مَیں نے بارہا آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور اب بھی یہی کہنا ہے کہ آپ صرف:

''حضرت والدی ماجدی علیہ الرحمہ'' ہی کے تصوّر میں مطمئن رہیں۔حضرت نانا صاحب قبلہ الرحمہ اور حقیر ناچیز بھی اسی نسبتِ حبّی میں موجود ہیں،اس سے الگ نہیں، جو کچھ بھی آپ سے آسانی سے ہوسکے، وہ کریں۔قلب وذہن پر جن اشغال سے گرانی ہو، ان کو چھوڑ دیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات عالم الغیب ہے،اس پر سب کچھ روشن ہے۔روحانی اور ایمانی طور پر تو آپ ماشا اللہ صحت مند ہیں،کبھی بھی خود کو روحانی مریض نہ سمجھیں۔یہ تخیّلات وتوہمّات اور مختلف رنگوں کی روشنیاں ایمان ویقین کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔[۹]

۱۴/ اکتوبر کے مکتوب میں تو یہ بھی تحریر فرمادیا کہ سوائے فرض وسنت وواجبات کے سب چھوڑ دیں،طبیعت پر بوجھ ڈال کر مستحبات ادا نہ کریں اور اپنی صحت کا خیال رکھیں۔[۱۰] یقیناً:

ع سالک بے خبر نہ بود راہ ورسم منزلہا

(سالک (مرشد) روحانیت کے راستوں اور منازل سے بے خبر نہیں ہوتا۔)

مذکورہ تحریر میں مرض کی حقیقت کے ساتھ اس کا علاج بھی تجویز کردیا گیا ہے۔یہ علاج روحانی بھی ہے اورنفسیاتی بھی۔اس عبارت میں تسلّی بھی موجود ہے اور امید کی کرن بھی دکھائی گئی ہے۔کئی خطوط میں عمومی انداز کے ساتھ علمی اور مدلّل انداز میں بھی سمجھایا گیا ہے،کیوں کہ مسافرانِ معرفت کی کیفیات میں جو تغیّر و تبدّل ہوتا ہے، وہ اِس کی تفہیم سے قاصر ہوتے ہیں۔اسے مرض سمجھ کر تشویش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ان امراض اور تشویشات کو شیخ مریدین کی ذہنی،علمی اور روحانی استطاعت کے مطابق دور کرتے ہیں۔جہاں ضرورت ہوتی ہے،قرآن اور حدیث کی مدد سے تدارک کیا جاتا ہے،کہیں بزرگوں کے واقعات اور زندگی کی عام مثالوں کا سہارا لے کر سمجھایا جاتا ہے،یہی صورت اس مختصر سے مجموعے میں نظر آتی ہے۔۲۰/ جون ۱۹۸۱ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ توہمات اور وساوسِ باطنی کا بہترین علاج یہی ہے کہ انھیں ذہن سے محو کردیا جائے بقول قرآن الا اتباع الظن سے صحیح نتیجہ اخذ نہ کیا جائے بلکہ وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر العباد کی آیت کے مفہوم وشعور سے ان کو سپردِ خدا کیا جائے۔[۱۱]

ان خطوط میں صوفیانہ علم و دانش کے وہ گہرآب دار بھی پنہاں ہیں، جو قلب وذہن کو متاثر کرتے ہیں۔جن سے زندگی کے باطنی پہلوؤں سے شناسائی ہوتی ہے۔اطمینانِ قلب کے طریقے سیکھنے کو ملتے ہیں۔سکونِ قلب کا ایک اہم ذریعہ مثبت طرزِ فکر ہے جو بدگمانیوں کے خاتمے سے جنم لیتی ہے۔یہ بدگمانی اور

شک، شیطان کا خاص حربہ ہے۔ شک اور بدگمانی اضطرابِ قلب اور انتشارِ ذہنی کا اہم سبب ہے جو راہِ معرفت میں سدِّ راہ ہوتا ہے۔ اسی لیے صوفیۂ کرام صفائے قلب کے لیے ہر ایک سے خوش گمانی رکھنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ اس خوش گمانی اور مثبت طرزِ فکر کی تلقین جامعیت کے ساتھ اِن خطوط میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لکھتے ہیں: ''سالک کسی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھے، دوست ہی جانے اور جو کرے گا سو بھرے گا، آپ سے جو کچھ بھی آسانی سے یاد اللہ ہوسکے کریں۔''[۱۲] اِسی نکتے کو ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے مکتوب میں قرآن وحدیث کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے:

> ظن المومنین خیرا (حدیث) اور بمصداق آیتِ قرآنی یاایہاالذین اٰمنوا اجتنبو کثیر من الظن ان بعض الظن اثم (اے ایمان والو بچو بدگمانیوں سے یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) خود کو وہم وبدگمانی سے ذہنی طور پر خالی رکھتا ہوں اور اہلِ ایمان کے ساتھ نیک گمانی رکھنے سے مجھے ایک گونہ روحانی وایمانی مسرّت وشادمانی حاصل ہوجاتی ہے، یہی ''نسخۂ روحانی'' آپ کے لیے بھی اِن شاء اللہ تعالیٰ مجرّب اور باعثِ مسرتِ روحانی ہوگا۔[۱۳]

اِسی نکتے کو خواجہ غریب نواز چشتیؒ نے اپنے خلیفہ خواجہ بختیار کا کیؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ دشمن سے بھی دوستی کا معاملہ کرنا۔[۱۴]

راہ سلوک پر گام زن ہونا ہر عہد میں دشوار رہا ہے۔ یہ دشواری اُس وقت آسان ہوجاتی ہے کہ جب محبت کا جذبہ سالک کے دل میں موج زن ہوجائے، محبت کی دل ودماغ میں تخم ریزی اور افزائش کے لیے صوفیۂ کرام نے خدمتِ خلق اور تکریمِ خلق کا نسخہ مرحمت فرمایا ہے۔ جس سے اللہ کی رِضا اور اُس کا کرمِ خاص حاصل ہوتا ہے۔ ان خطوط سے خدمتِ خلق کی اہمیت اور ترغیب ملتی ہے۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۸۵ء کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرے مخلص چند احباب یا رفقائے کار آپ کی طرح نیک عزائم کے ساتھ اپنے تعاونِ خیر کا تسلسل جاری رکھیں تو رحمتِ خداوندی سے بعید نہیں ہے کہ میرے نیک عزائم جو سراسر رفاہِ عام اور خدمتِ خلق پر ہی مبنی ہیں ضرور بروئے کار آجائیں۔''[۱۵] ایک اور مکتوب میں لکھا کہ ''میں روزانہ صبح ۱۰ بجے سے ۲ بجے تک اور شام کو عصر سے مغرب تک حسبِ معمول خدمتِ خلق کے لیے باوجود اپنی ناسازگیٔ طبیعت کے آستانہ شریف میں بیٹھا رہتا ہوں اور ہر آدھ گھنٹے میں بوجہ تکلیف اٹھتا رہتا ہوں۔''[۱۶] اسی طرح ایک مکتوب میں ''گیارھویں نامہ'' کے نام سے کتاب شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس میں غوثِ پاکؒ

کے حالات و واقعات تحقیقی انداز سے شائع کرنے کے ساتھ، عوام کی فلاح و بہبود اور غریبوں سے حسنِ سلوک اور دکھی انسانیت کی خدمت کی ترغیبات شامل ہوں۔[۱۷]

ان مکتوبات کا اسلوب ادبی حسن لیے ہوئے ہے، مقصد کو واضح اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عاجزی کا پہلو بیش تر مکتوب میں دکھائی دیتا ہے۔ بہت سے مکتوبات میں عام فہم اردو اشعار تحریر کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں فارسی اشعار بھی لکھے ہیں مگر ان کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ ایک بے تکلفی کا انداز ہے، جس میں اپنے حالات سے آگاہی دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی گئی ہے۔ جس سے اپنائیت اور قربت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک خاص رنگ اِن خطوط کا یہ بھی ہے کہ ان کے مطالعے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اِن خطوط کا مخاطَب کوئی مرید یا عقیدت مند ہے۔ اسلوب کی مثالیں اوپر بیان کردہ اقتباس سے ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، اگرچہ اِن مکتوبات کی تعداد کم ہے مگر اس میں موجود لوازمہ اپنی ادبیت، اصلاحی خصوصیات اور سالک کی تربیت کے حوالے سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کو قادری پبلی کیشنز، کراچی نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔

مکاتیبِ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مولانا مفتی محمد شفیعؒ کو تحریر کیے۔ یہ خطوط، مکتوب الیہ کے لکھے گئے خطوط کے جوابات ہیں۔ کیوں کہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کا خطوط نگار سے اصلاحی، تربیتی اور روحانی تعلّق تھا۔ اس سلسلے میں جو معاملات مکتوبِ الیہ کو پیش آتے، وہ مکتوب نگار کو تحریر فرما دیتے، پھر وہ جوابات سے نوازتے۔ ان خطوط کے تحریر کرنے کی وجہ بھی اس کتاب سے مل جاتی ہے، جب مکتوب الیہ تربیت کی غرض سے تھانہ بھون تشریف لے گئے اور عرض کیا کہ ''آپ سے اصلاح و تربیت چاہتا ہوں، اس میں اگر بیعت ہونا ضروری ہو تو مجھے بیعت فرمالیں۔''[۱۸] بیعت سے تو حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ نے منع فرمایا مگر اصلاح کی حامی بھر لی اور فرمایا کہ تمھارے ذمّے دو کام ہوں گے، ایک حالات کی اطلاع اور دوسرے میرے مشورے کی اتباع۔ میرا کام حالات کو دیکھ کر مشورہ دینا ہوگا، یعنی مکتوب الیہ کے ذمّے دو کام تھے، اطلاع اور اتباع، اوّل الذکر کی وجہ سے مکتوب الیہ کو خطوط تحریر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب کہ مکتوب نگار کا کام مشورہ دینا تھا تو یوں انھیں خطوط تحریر فرمانے پڑے۔

زیرِ بحث خطوط کی سب سے اہم خاصیت یہی ہے کہ سالک کو اِن میں روحانی تربیت اور فکری پہلوؤں پر بہت سے نکات مل جاتے ہیں۔ کیوں کہ بیش تر سوالات کا تعلّق تربیت اور اصلاحِ باطن سے تھا۔ مکتوب نگار نے ان دونوں پہلوؤں پر بہت ہی جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جیسا کہ تربیت کے حوالے سے درخواست کے جواب میں آپؒ نے فرمایا، ''تمھارے عمل کا خلاصہ دو لفظ ہیں۔ اطلاع و اتباع''۔ اِن خطوط کی

ایک اور خصوصیت جو بہت کم خطوں میں موجود ہوتی ہے؛ کہ جن خطوط کے جوابات تحریر کیے گئے ہیں، وہ خطوط بھی جوابات سے قبل پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہ بیک وقت مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکاتیب کا مجموعہ ہوگیا ہے۔ جس سے دونوں اکابرین کی صفات و عادات اور کردار کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

مذکورہ خطوط میں صرف روحانی درجات طے کرنے کے طریقے ہی درج نہیں کیے گئے بلکہ ایک بہتر زندگی گزارنے کے اصول بھی قرآن وسنت اور موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی یہ خطوط دنیا و آخرت کی بہتری کے لیے معاون ہیں۔ ان میں وہ ہدایات اور مشورے درج ہیں، جن پر عمل پیرا ہوکر کوئی بھی فرد اپنی زندگی کو پُرسکون بنا سکتا ہے۔ آخرت کے حوالے سے یہ نکتہ کس قدر پُر تاثیر ہے کہ جب مکتوب نگار نے اپنے اس عیب کی اطلاع دی کہ میرا میلان اُمرا کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اِس خط کے جواب میں حکیم الامّت اشرف علی تھانویؒ نے لکھا کہ ''ایسے وقت اللہ تعالیٰ کی رویت کا اہتمام کے ساتھ استغفار کیا جاوے، کہ وہ میرے اس میلان اور رعایتِ میلان کو دیکھ رہے ہیں اور یہ بڑی غیرت کی بات ہے، کہ وہ اس حالت میں مجھ کو دیکھیں اور اگر پوچھنے لگیں تو کیا جواب دوں گا۔ اس سے خود بخود طبیعت ہٹ جاوے گی۔''(۱۹)

اسی طرح مکتوب الیہ یعنی مفتی محمد شفیعؒ کی اس عبارت سے جہاں علم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں علم کو محفوظ کرنے کی فکر اور سلیقہ مندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ذیل کا اقتباس، بظاہر تو چند سطروں پر مشتمل ہے مگر ان میں اہلِ علم کے لیے غور وفکر کا بڑا سامان ہے۔ جس سے آج بھی ہمارے عہد کے لوگ نا آشنا ہیں۔

> دارلعلوم میں جو فتاوٰی لکھے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ درج رجسٹر ہوتے ہیں۔ اس وقت تک بڑے بڑے عظیم الشان تقریباً دس رجسٹر تیار ہیں۔ ان میں بہت سے اہم فتاوٰی بھی ہیں، جو حضرت مفتی صاحب مرحوم کی عمر کی کارگذاری اور ان کی یادگار ہے لیکن رجسٹروں کی کوئی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے محض بیکار پڑے ہیں ضائع ہونے کا بھی اندیشہ ہے، اس لیے بار بار خیال آیا کہ ان کی اشاعت کی کوئی صورت ہو تو بہتر ہے۔(۲۰)

موجودہ ادبی صورتِ حال میں کتابیں، ان پر تبصروں اور ''تبصروں پر تبصروں'' کے سبب اکثر مبصر اور قاری کشمکش ہی کا شکار رہتے ہیں۔ مبصر مصلحت پسندی اور ثنا نویسی پر مجبور دکھائی دیتا ہے۔ اس معاملے پر بھی ایک خط میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب مکتوب الیہ نے ایک رسالہ اصلاح اور تقریظ کے لیے ارسال کیا تو جواباً تحریر

فرمایا کہ اصلاح کی درخواست تو ایسی ہے جیسے اعرج سے مشی کو کہا جائے۔(جیسے لنگڑے کو پیدل چلنے کو کہا جائے)۔ یہ تو مکتوب نگار کی عاجزی ہے، اِس کے بعد لکھا کہ بعض جگہ سہوِ کاتب نظر آیا جو نظرِ ثانی سے درست ہوسکتا ہے۔مثلاً ایک جگہ ابوطلحہ باپ اور بیٹے کا نام تحریر ہے،تقریظ کے بارے میں مَیں نے پہلے بھی یہ تحریر کیا کہ مجھے تقریظ کا فن نہیں آتا اور عرفی تقریظ رسم پرستی اور محض دل جوئی ہے، متدعی کی، جو طبعاً پسند نہیں[۲۱] پھر رسالے کی تعریف میں بھی جو کچھ لکھا ہے، اس میں بھی ایک توازن پیدا کیا گیا ہے۔

خطوط کے محرکات کا تذکرہ کچھ اوپر بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کا پس منظر مکتوب الیہ کی تربیت واصلاح تھا جو بڑھتے بڑھتے ایسے قلبی تعلق میں تبدیل ہوگیا، جس میں راقمین ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں۔استاد طالب علم کی وہ عزّت افزائی فرمارہے ہیں، جسے پڑھ کر رشک آتا ہے۔ایک خط کا آغاز اس طرح کیا ہے کہ:

> القاب اس لیے نہیں لکھے کہ سمجھ میں نہیں آیا آپ کے والد ماجد صاحب دام فیضہم کے تعلق اخوہ پر نظر کرکے عزیزم لکھنے کو دل چاہتا تھا مگر آپ کے کمالات کو دیکھ کر اس لکھنے کو بے ادبی سمجھا اور اگر کمالات پر نظر کرکے اس سے بڑھا کر لکھوں تو حضرت استاد جی مولانا محمد یعقوب صاحب کا ملفوظ مبارک اس سے روکتا تھا۔ارشاد فرمایا کہ زیادہ تعظیمی الفاظ اپنے مخصوصین کو لکھنا، موہوم اجنبیت ہے،اس کو بھی دل گوارا نہ کرتا تھا آخر سلام ہی کو القاب سے مغنی سمجھا۔[۲۲]

دونوں بزرگان کے خطوط میں مقصد پر توجہ دی گئی ہے۔ جو مکتوب الیہ کے خطوط ہیں،ان میں بھی اختصار ہے اور جو جواب دیے گئے ہیں ۔وہ بھی مختصر ہیں۔ جوابات بیش تر مقامات پر سوالات سے بھی چھوٹے ہیں۔عربی، فارسی اشعار اور ضرب الامثال کا استعمال موضوع کی تصریح اور بیان میں لطافت پیدا کرتے ہیں۔ان عربی اور فارسی عبارت کے اردو ترجمے حاشیے میں تحریر کیے ہیں۔بعض مقامات پر یہ مفتی محمد شفیعؒ کے ہیں اور بعض ان کے پوتے اور مفتی تقی عثمانی کے بھتیجے مولانا محمود اشرف عثمانی نے کیے ہیں۔[۲۳] بعض حواشی میں کچھ شخصیات کا انتہائی مختصر حوالہ بھی دیا گیا ہے،یوں ان حواشی نے مکاتیب کی اہمیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔اندازِ بیان سادہ مگر علمی ہے۔اس میں بعض مرتبہ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

کتاب کی اشاعتی تفصیل یہ ہے۔طبع جدید، اگست ۲۰۰۵ء،ادارۃ المعارف کراچی۔حرفِ آغاز سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت اوّل ۱۹۹۵ء میں ہوئی ہوگی۔

معرفت نامے ڈاکٹر میرزا اختیار حسین کیف نیازی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو فہرست اور تحریر کے مطابق ۱۲۲ مکتوبات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بہت سے اُن خطوط کے جوابات ہیں، جن میں آپ سے سوالات پوچھے گئے تھے۔ ان کے علاوہ وہ ہدایتیں بھی ہیں جو مختلف تاریخوں میں لکھے گئے خطوط کے اقتباسات کی صورت میں محفوظ رہ گئیں۔ جیسا کہ بشارت علی کے نام خطوط سے پتا چلتا ہے۔[۲۴] ان پر خطوط کے نمبر نہیں دیے گئے ہیں۔ یہ بائیس افراد کو لکھے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ خطوط یعنی ۲۷ مکتوب نگار کے فرزند میرزا احسن نظامی (رومی) کے نام ہیں۔ جس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ آپ کے فرزندِ عزیز حصولِ تعلیم کے لیے لندن تشریف لے گئے تھے۔ لندن کی منفی فضاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ رابطہ بہت ضروری تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ رومی کے لندن جانے سے قبل اُن کی والدہ کا وصال ہو گیا تھا، تیسرا سبب یہ کہ مکتوب نگار خود دوسرے ملک سعودی عرب میں تھے۔ وہ خود غریب الوطنی کے درد سے آشنا تھے، چوتھا سبب یہ تھا کہ رومی کو اپنے خاندان کی شرافت اور نجابت اور صوفیانہ تعلیمات سے آگہی دینے کے ساتھ، خاندانی تربیت یعنی صوفیانہ ماحول سے روشناس کرانا تھا۔

اِن خطوط کے بنیادی موضوعات تو وہی ہیں جو سرورق پر دیے گئے ہیں۔ یعنی تصوّف، وحدت الوجود، اخلاقیات و الٰہیات، مگر ان میں مذکورہ بالا موضوعات سے متعلق ایسی معلومات اور نکتے فراہم کیے گئے ہیں، جن سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ان میں قرآنی آیتوں کی تفسیر بھی پیش کی گئی ہے۔ خطوط کے علاوہ بھی آپ تسمیہ، سورۃ فاتحہ اور حروفِ مقطعات کی تفسیر علیٰحدہ علیٰحدہ علاحدہ کتب میں تحریر کی ہیں۔ قُل ان بشر مثلکم والی آیات پر مسالک میں اختلافی پہلو بھی خطوط میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا تحریر فرماتے ہیں:

> بشریت کے متعلق قرآن پاک میں تین جگہ آیات ہیں اور تینوں میں ''قل'' کے ساتھ ہیں۔ ''قل'' کے معنی ہے ''کہہ دو'' اس میں نکتے کی بات یہ ہے کہ تینوں جگہ اللہ پاک نے یہ کہا ہے کہ اے محمد ﷺ تم کہہ دو کہ میں بشر ہوں۔ یعنی خداوند کریم نے خود یہ کہیں نہیں کہا ہے، کہ اے محمد ﷺ تم بشر ہو یا لوگوں سے یہ کہیں نہیں کہا، اے لوگو! تم محمد کو بشر سمجھو۔ (۲۵)

پھر اس کی مثال میں کہا کہ اگر کوئی بادشاہ یا صدر اپنے کسی کلکٹر کو ضلع کا حاکم بنا کر کہے کہ تم کہو کہ میں عوام کا

خادم ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بادشاہ یا عوام اسے خادم کہنا شروع کر دے۔ یہ کسرِ نفسی اور عاجزی کا اظہار ہے۔ اِن خطوط میں خانقاہی رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔ اپنے بیٹے رومی کو خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ میری عمر ۱۵ سال بھی نہیں تھی اور میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا، بعض لوگوں کا رویّہ بہت تکلیف دہ تھا۔ مقابلے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ ٹی۔ بی ہو گئی۔ جب میں کسی قابل بھی ہو گیا تو ان رویّوں کا نہ بدلہ لیا اور نہ حوالہ دیا۔(۲۶) اسی طرح ایک اور موقع پر تحریر فرمایا۔

> لوگوں کی آؤ بھگت معیار زندگی ہی بڑھنے سے ہوتی ہے، دنیا اسی کا نام ہے۔ لوگوں کی عزّت اور محبت میں یہی عنصر غالب ہوتا ہے۔ ہماری پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ زمانہ بھی ہم پر گزرا ہے جب ایک وقت کھا کر دوسرے وقت کی روٹی کی فکر ہوتی تھی۔ بیٹے یہی دنیا ہے اور یہی تجربے کی باتیں ہیں جو زندگی میں کام آتی ہیں۔ لوگوں سے اخلاق و محبت سے ملو۔ اپنی زندگی کا معیار بلند رکھو، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔(۲۷)

یہ نصیحتیں بظاہر اپنے فرزند کو کی ہیں لیکن ان کا اطلاق تمام سالکین اور افراد پر ہوتا ہے۔ موجودہ دور اور زندگی میں اس پہلو کی بہت ضرورت ہے۔ خاص طور پر بڑے شہروں میں اخلاص کے ساتھ اخلاق و محبت شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بقول معراج جامی جس طرح دھواں اپنے سیاہت سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح بڑے شہروں میں منفی خیال کے حامل اور گم راہ لوگوں کی خامیاں دوسروں تک پہنچتی ہیں۔ یوں اس کی لپیٹ میں معاشرے کے بیش تر افراد آجاتے ہیں۔(۲۸)

خانقاہوں اور مشائخ کی حالت پر اہلِ دل حضرات ہر دور میں شکوہ کناں رہے ہیں۔ خانقاہوں کی ابتدا کے فوراً بعد ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسی لیے تصوُّف کی بیش تر بنیادی اور ابتدائی کتب میں اُن نام نہاد صوفیا کی حقیقت کو افشا کیا گیا ہے، جیسا کہ عوارف المعارف میں شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں، ''پھر ایک گروہ نے اہلِ فتنہ و گم راہی سے اپنے کو ملامتیہ کہلایا اور لباسِ صوفیہ سے ملتبس ہوئے تاکہ اس سے صوفیا کی طرف منسوب ہوں اور صوفیہ سے وہ کسی بات میں نہیں ہیں بلکہ وہ دھوکے کے دھڑی اور غلطی میں ہیں۔''(۲۹) اسی طرح داتا گنج بخش ہجویریؒ نے صوفیا کی قسمیں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ صوفیا کی ایک قسم مستصوف ہے، ''جو دنیوی عزت و منزلت اور مال و دولت کی خاطر خود کو ایسا بنا لے اور اسے مذکورہ منازل و مقامات کی کچھ خبر نہ ہو۔''(۳۰) ان بیانات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُس دور میں بھی ایسے لوگ تھے جو

صوفیا کے لباس میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل اور لوگوں سے فریب کرتے تھے۔ اُس زمانے اور موجودہ زمانے میں فرق یہ ہے کہ ماضی بعید میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی، اچھے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی تو اچھے لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی۔ جس طرح اگر کوئی شخص ایسے صاف ستھرے ماحول میں رہتا ہے، جہاں مکھیاں بالکل نہ ہوتو ایک مکھی بھی آجاتی ہے تو اُسے کھلتی ہے۔ یہ ماضی کی صورتِ حال تھی۔ حال کی صورت یہ ہے کہ یہ تناسب الٹا ہوتا جارہا ہے۔ بتدریج اچھے لوگ کم اور بُرے لوگ بڑھتے جارہے ہیں۔ ان خطوط میں موجودہ خانقاہی صورتِ حال پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے، ماضی کے بزرگوں کی اعلا صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> صاحبِ خانقاہ حضرات بجاے یاد اللہ میں دل چسپی لینے کے بجائے عیش پسند اور کاہل ہوتے گئے، اور نذر کا جو مقصد تھا وہ ختم ہوگیا، ان لوگوں کی لالچ نذر کے لیے بڑھتی گئی اور یوں پیشہ ورانہ ذہنیت بڑھتی گئی اور اس کو بھی حصولِ زر اور کمائی کا ذریعہ بنایا جانے لگا۔ وہ روح رفتہ رفتہ ختم ہوگئی یہی حالت تعلیمات کی ہوئی۔ سجادہ نشینوں کو باپ دادا کی لکھی ہوئی تعلیمات اور زبانی خود ان کے ذریعے اشغال، اذکار، مراقبات وغیرہ معلوم ہوجاتے تھے، لیکن ان پر عمل کرنا بند کردیا۔ صاحب زادگی اور پیرزادگی کی وجہ سے عزت مِل جاتی تھی۔ خانقاہوں کے ذریعے نذر، اس لیے وہ جدوجہد، ریاضات اور مجاہدے کون کرے، یہی وجہ اس مَشرب کی بدنامی ہوئی۔ (۳۱)

ان خطوط میں خاندانی معاملات، فنونِ لطیفہ، جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج، تبلیغی طریقۂ کار، تصوف کی اصطلاحات کی تشریح و توضیح وغیرہ پر علمی انداز میں بحث ملتی ہے۔ الغرض خانقاہی ادب میں خطوط کی جو خصوصیات ہونی چاہییں، وہ صفات ان خطوط میں موجود ہیں۔ خطوط، مکتوب نگار کی شخصیت کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ ان خطوط سے مصنف کی بہت سی صفات کا پتا چلتا ہے۔ ایک تو اُن کی عاجزی وانکساری جو چھوٹے بڑے ہر ایک مخاطَب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی علمی حقیقت کا انکشاف بھی کرتے ہیں اور اس سے برتری کا گمان محسوس ہوتا ہے تو فوراً اس کی وضاحت کردیتے ہیں، دوسری صفت یہ کہ ہر خط کا جواب وقت پر دیتے ہیں۔ ڈاک کے نظام کی خرابی کے سبب خط تاخیر سے ملتا ہے یا جواب میں اگر دیر ہوتی ہے تو اس پر معذرت کرتے ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب نگار کی علمی حیثیت، وسیع مطالعہ اور تجزیہ نگاری کا پتا چلتا ہے۔

خطوط کا بنیادی محرک یہ تھا کہ مکتوب نگار بسلسلۂ ملازمت سعودی عرب تشریف لے گئے تو اُن کے مریدین اور عقیدت مند ان سے اُن کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ سالکین اور عقیدت مندوں کو روحانی اور دنیوی معاملات میں الجھنیں اور اِشکال پیش آتے، وہ آپ سے خطوط کے ذریعے رہ نمائی حاصل کرتے، دوسرا محرک آپ خاندان کے ایک بڑے اور علمی فرد ہیں۔ اُن لوگوں کے خاندانی معاملات میں خطوط کے ذریعے قیمتی مشورے عنایت فرماتے اور انھیں اخلاقی اور صوفیانہ طرز زندگی پر قائم رکھنے کی سعی کرتے۔ ان خطوط میں سب سے زیادہ مکتوب الیہ رومی (فرزند اختیار حسین کیف نیازی) کے نام ہیں جس کا سبب اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک ان خطوط کی اشاعت کا تعلق ہے۔ اس میں آپ کے فرزند حسن رومی اور پھوپی زاد بہن کے نواسے رضی نے اس نکتے کو آشکار کیا کہ جو خطوط محفوظ ہیں، انھیں لوگوں کے استفادے کے لیے شائع کیا جانا چاہیے۔[۳۲] جنھوں نے تمام مکتوب الیہان سے خطوط اور ان کی اشاعت کی اجازت حاصل کی۔

خطوط کے زبان و بیان کے بارے میں اگرچہ مصنف نے کتاب کے آغاز ہی میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ کہ ''یہ خطوط شعوری طور پر طباعت کے لیے نہیں لکھے گئے تھے اس لیے یقیناً اِس میں زبان و بیان کی خامیاں ہوں گی لیکن افادیت کے نقطۂ نظر سے امید ہے، کارآمد ہوں گے۔'' حقیقت اس کے برخلاف ہے، خط مختصر ہوں یا طویل، ان میں سے کچھ خطوط میں زبان و بیان کی بہت زیادہ خوب صورتی نہیں ہے تو زبان و بیان کی خامیاں بھی نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے خطوط میں موضوع اور مکتوب الیہ کے اعتبار سے اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ نجی معاملات میں اندازِ بیان سادہ اور زبان عام فہم ہے، جہاں علمی نکتے کی تشریح کی گئی ہے۔ وہاں علمی انداز ہے۔ ادبی اسلوب بھی جا بجا موجود ہے۔ تشبیہ اور استعارے کی مدد سے نکات کی تشریح کی گئی ہے۔ آپ کے اسلوب میں اردو اور فارسی کے اشعار نہ صرف حسنِ بیان میں اضافہ کرتے ہیں، بلکہ بات کی تفہیم میں بھی آسانی کا سبب بنے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اندازِ تحریر ہندی مزاج لیے ہوئے بھی ہے۔ یہ خطوط ایک ہندو مذہب رکھنے والے فرد سیٹھ ما کو بھائی کو لکھے گئے ہیں۔ ان میں اللہ کی بجائے ایشور، بھگوان، دھرم، مُکتی، سنسار وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ ہندوی مزاج ہلکا پھلکا اور خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اندازِ تحریر کی کچھ مثالیں اوپر آچکی ہیں۔ اس لیے علیٰحدہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب کے اشاعتی کوائف یہ ہیں:

ڈاکٹر میرزا افتخار حسین کیفؔ نیازی: معرفت نامے، کراچی، جماعت السالکین خانقاہِ آغائیہؒ مرتضویہؒ، ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔

خانقاہی ادب میں خطوط کی اہمیت مسلم رہی ہے، بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سالکین کی تربیت اور ذہنی و

فکری ارتقا میں خطوط کا اہم کردار رہا ہے۔سالکین کے لیے ان خطوط میں نصیحتیں اور ہدایتیں موجود ہیں۔اُن کی ذہنی،فکری اور روحانی الجھنوں کے جوابات ہیں۔ان مکاتیب میں سماجی، اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔خانقاہی نظام کے حوالے سے شریعت وطریقت کے نکات بھی ان خطوط کی زینت بنے ہیں۔

حواشی

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۶۔
۲۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، طبع دوم)، ص ۱۸۶۔
۳۔ تبسم چوہدری، تذکرہ پیران پاگارہ، (حیدرآباد: انڈس پرنٹر، ۱۹۷۵ء، اشاعت اوّل)، ص ۹۹۔
۴۔ اومکار کول اور مسعود سراج، اردو اصناف کی تدریس، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۵۳۔
۵۔ رفیع الدین ہاشمی، محولۂ بالا، ص ۱۷۷۔
۶۔ النمل ۲۸:۲۷۔
۷۔ حمیداللہ، سیاسی وثیقہ جات، (لاہور، مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۰۵ء، طبع دوم)۔
۸۔ ذوالفقار علی دانش، سندھ کے مشائخ نقشبند اور اردو مکتوب نگاری کی روایت، مشمولہ تحقیق، شمارہ ۱، جلد ۲۰، (شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، جنوری، جون ۲۰۱۲ء)، ص ۶۲ تا ۹۳
۹۔ غلام رسول قادری، مکتوبات علمی، مرتّب ڈاکٹر فریدالدین قادری، (کراچی: قادری پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۲۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۵۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۹۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔
۱۴۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الخیار، مترجم: محمد عبدالاحد قادری، (لاہور: ممتاز اکیڈمی، س ن)، ص ۷۰۔
۱۵۔ غلام رسول قادری، محولۂ بالا، ص ۴۱۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۹۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۵۴۔
۱۸۔ اشرف علی تھانوی، مکاتیبِ حکیم الامت، مرتّب مفتی محمد شفیع (کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، طبع جدید)، ص ۱۹۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۵۱۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۲۴، ۲۵۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۴۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۶۔

۲۴۔ میرزا اختیار حسین کیف نیازی، معرفت نامے، (کراچی: جماعت السالکین خانقاہِ آغائیہ مرتضویہؒ، ۲۰۰۰ء) ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۲۸۔ ایک نجی نشست میں یہ جملے ادا کیے گئے۔

۲۹۔ شہاب الدین سہروردی، عوارف المعارف، مترجم ابوالحسن، (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۴ء) ص ۹۵۔

۳۰۔ علی بن عثمان ہجویریؒ، کشف المحجوب، مترجم مفتی سید غلام محی الدین نعیمیؒ، (لاہور: شبیر برادرز، س ن) ص ۶۰۔

۳۱۔ میرزا اختیار حسین کیف نیازی، محولۂ بالا، ص ۱۱۵۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۔

مآخذ

۱۔ تھانوی، اشرف علی، مکاتیب حکیم الامت، مرتّب مفتی محمد شفیع، کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، طبع جدید

۲۔ چوہدری، تبسم، تذکرہ پیران پاگارہ، حیدرآباد: انڈس پرنٹر، ۱۹۷۵ء، اشاعت اوّل۔

۳۔ حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات، لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۰۵ء، طبع دوم۔

۴۔ دانش، ذوالفقار علی، سندھ کے مشائخ نقشبند اور اردو مکتوب نگاری کی روایت، مشمولہ تحقیق، جام شورو، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، شمارہ ۱، جلد ۲۰، جنوری، جون ۲۰۱۲ء۔

۵۔ دہلوی، شیخ عبدالحق محدث، اخبار الخیار، مترجم محمد عبدالاحد قادری، لاہور: ممتاز اکیڈمی، س ن۔

۶۔ سہروردی، شہاب الدین، عوارف المعارف، مترجم ابوالحسن مرحوم، لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۴ء۔

۷۔ صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، سلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، طبع دوم۔

۸۔ قادری، غلام رسول، مکتوبات علمی، مرتب ڈاکٹر فرید الدین قادری، کراچی: قادری پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

۹۔ کول، اومکار اور سراج، مسعود، اردو اصناف کی تدریس، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء۔

۱۰۔ نیازی، میرزا اختیار حسین کیف، معرفت نامے، کراچی: جماعت السالکین خانقاہِ آغائیہ مرتضویہؒ، ۲۰۰۰ء۔

۱۱۔ ہاشمی، رفیع الدین، اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

۱۲۔ ہجویری، علی بن عثمان، کشف المحجوب، مترجم مفتی سید غلام محی الدین نعیمیؒ، لاہور: شبیر برادرز، س ن۔